محمد اسلم نجمی

کاروانِ زندگی

[دینِ اسلام پر کیسے عمل ہو؟ یہ شریعت اور قانون کا موضوع ہے۔ یہ دین کیسا ہو؟ یہ حقیقت صرف قرآنِ مجید ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ کاروانِ زندگی میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ اس کتاب کی ہر صحیح بات استاذِ گرامی اور الامام الاستاذ کی علمی مجلسوں اور تصنیفات سے ماخوذ ہے، میری حیثیت بس ایک ناقل کی ہے۔]

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں اپنی بیان کردہ نشانیوں کو سمجھنے، ان سے سبق حاصل کرنے اور فائدہ اٹھانے کے لیے عقل کو لازم قرار دیتے ہیں: (اپنی صفات اور حقوق میں دوسروں کی حصہ داری کے بارے میں اللہ تمھیں متنبہ کرتا ہے اور) وہ تمھارے لیے خود تمھارے اندر سے ایک تمثیل بیان کرتا ہے کہ کیا ہم نے تم کو جو رزق اور فضل بخشا ہے اس میں تمھارے مملوکوں میں سے بھی کچھ شریک ہیں کہ تم اور وہ اس میں برابر کے حقوق رکھنے والے بن گئے ہو، اور جس طرح تم اپنوں کا لحاظ کرتے ہو اسی طرح تم ان کا بھی لحاظ کرتے ہو؟ (یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ جو رزق اللہ نے تمھیں دے رکھا ہے اس میں تم اپنے غلاموں کے لیے بھی اسی طرح کی حصہ داری تسلیم کر لو۔ تو پھر یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ خدا کے حقوق میں تم اس کی مخلوقات میں سے کسی کو شریک بنا لیتے ہو۔ یہ وضاحتِ مقصد کے لیے ایک ایسی دلیل ہے کہ اس کے بعد شرک کی غلاظت سے آلودگی کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں (یعنی یہ دلائل انھی کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں جو عقل سے کام لیں۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنی عقلوں پر پردے ڈال کر اور دلوں پر تالے لگا کر انھیں معطل کر رکھا ہے ان کے لیے یہ دلیلیں کارآمد نہیں ہو سکتیں۔ (۳۰:۲۸)

اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری کتابِ ہدایت میں بیان ہونے والے حقائق بالکل واضح ہیں، مگر کسی بات کو تسلیم

کرنے کے لیے اس کا صرف واضح ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے دو باتیں ازبس ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب صاحبِ عقل ہو اور دوسرے یہ کہ وہ حقائق کو سننے، سمجھنے اور ماننے کے لیے اپنی عقل بھی استعمال کرے کیوں کہ: (فطری اور بدیہی حقائق کی) یاددہانی تو اہلِ عقل ہی حاصل کرتے ہیں (لہٰذا علم وعقل سے عاری لوگ واضح سے واضح بات سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کر پاتے) (۹:۳۹): اللہ کے نزدیک بدترین جانور یہ گونگے بہرے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے (۲۲:۸) انسان کا امتیازی وصف سننا اور سمجھنا ہی ہے۔ اس وصف سے محروم ہو جانے کے بعد وہ بس دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور بن کر رہ جاتا ہے۔ اور جانور بھی بدترین جانور ۔۔۔ اس لیے کہ جانور خواہ کتنا ہی برا ہو وہ اپنی جبلت پر قائم رہتا ہے لیکن انسان اپنی خصوصیتِ نوعی سے محروم ہو کر حیوانیت میں چوپایوں کو بھی مات دے دیتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان اگر عقل وبصیرت سے کام لے تو اس کی عظمت وعروج کی کوئی حد نہیں اور اگر وہ اس خوبی سے محروم ہو جائے تو اس کی پستی کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہدایت وضلالت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اس نے ہر انسان کے اندر خیر وشر کو سمجھنے اور اس میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھی ہے۔ جو لوگ اس کو زندہ رکھتے ہیں اور اس سے کام لیتے ہیں، انھیں سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق ملتی ہے، درجہ بدرجہ ان کے علم میں ترقی ہوتی ہے اور ان پر ہدایت کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو اللہ کی اس نعمت کی قدر نہیں کرتے اور اپنی آنکھیں اور کان بند کر کے (اپنی سننے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو معطل کر کے اور عقل کو خیر باد کہہ کر) خیر وشر میں فرق وامتیاز کے وصف کو ضائع کر بیٹھتے ہیں، انھیں مزید ہدایت ملنا تو درکنار، قانونِ الٰہی یہ ہے کہ جو ہدایت انھیں فطرت سے ملی ہوئی ہوتی ہے وہ بھی سلب ہو جاتی ہے۔ حضرتِ مسیح علیہ السلام نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ جو غلام ایک پیسہ میں چور ثابت ہو اس کا مالک اسے ایک لاکھ روپے کی امانت کیسے سونپے گا!

اس بارے میں یہ بات ہر وقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ بسا اوقات عقل کو آفات لاحق ہو جاتی ہیں۔ غصہ، لالچ، شہوات، خواہشات اور جذبات اکثر اوقات عقل پر غالب آ کر اسے معطل اور مفلوج کر دیتے ہیں۔ ان صورتوں میں عقل صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی اور جذبات وشہوات کی مغلوبیت سے انسان کو انتہائی احمقانہ اور خودغرضانہ فیصلے کرنے کے لیے دلائل دینا شروع کر دیتی ہے۔ اور ان صورتوں میں بعض اوقات انتہائی بے عقلی کا کام بھی بہت معقول نظر آنے لگتا ہے۔ اور اچھا بھلا صاحبِ عقل انسان وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جس کام کی کسی بے وقوف شخص سے بھی

توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایسا شخص جب ہوش میں آتا ہے اور اس کی عقل ان آفات سے چھٹکارا پا کر صحیح طریقے سے سوچنے کے قابل ہوتی ہے تو اسے لازماً اپنے کیے پر حیرانی اور ندامت ہوتی ہے۔ وہ شخص اگر واقعی سلیم الفطرت ہو تو اسے اعترافِ حقیقت میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آتی۔ اس لیے انسان جب عقل کو ان آلائشوں سے پاک کر کے غور کرتا ہے تو بالآخر اسی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے جہاں قرآن اسے پہنچانا چاہتا ہے۔ ورنہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی کر رہا ہے دراں حالیکہ وہ اپنے نفس کو الٰہ بنا کر اس کی پرستش کر رہا ہوتا ہے۔

قرآن مجید کی ساری دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے۔ اس سے دور ہونے اور اس کے سمجھ میں نہ آنے کی وجہ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، عقل کی مغلوبیت، اس کا تعطل، نفس کی پرستش اور خواہشات کی پیروی ہے

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی گمراہیوں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ: کیا تم نے دیکھا اس کو (جسے اللہ نے اپنی کتاب و شریعت سے نوازا لیکن اس نے اس نعمت کی قدر نہ کی اور خواہشاتِ دنیا کے اسیر ہو کر خدا کی ہدایت کو نظر انداز کر دیا۔ یہ وہی ہے) جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے علم کے باوجود گمراہ کر دیا! (یعنی ان کا معاملہ یہ نہیں کہ انھیں علم کی روشنی میسر نہیں آئی بلکہ حادثہ یہ ہوا کہ انھوں نے خدا کے مقابلے میں اپنی خواہشوں اور بدعات کی پیروی کی۔ ان کے اس جرم کی پاداش میں اللہ نے انھیں نفس کے حوالے کر دیا۔ اللہ کی اس عظیم نعمت کی ناقدری کی سزا انھیں یہ ملی کہ یہود و نصاریٰ کا یہ طبقہ ہدایت کی روشنی سے محروم ہو گیا) اور (اللہ نے) اس (اس قبیل کے ہر شخص) کے کان اور اس کے دل پر مہر کر دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا! بھلا ایسوں کو کون ہدایت دے سکتا ہے اس کے بعد کہ اللہ نے ان کو گمراہ کر دیا! کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے (کہ اللہ تعالیٰ انھی لوگوں کو ہدایت کی نعمت سے سرفراز کرتے ہیں جو اس کی قدر کرتے ہیں۔ جو لوگ علم و معرفت کی دشمنی اور خواہشاتِ نفس کی غلامی میں اس ہدایت کی ناقدری کرتے ہیں، ان کے لیے وہ ہدایت ہی ضلالت کا پھندا بن جاتی ہے اور وہ خدا کے رسول اور اس پر نازل ہونے والی کتاب پر بے سروپا اعتراض کر کے اپنے ضمیر کو سلانے اور دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں) (۴۵: ۲۳)

وہ شخص جو اپنے نفس کو اپنا الٰہ بناتا ہے وہ دو کام کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ صحیح اور غلط کا فیصلہ اللہ کے بجائے اپنے نفس کو پوچھ کر کرتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی ترجیحات بھی اللہ کے مقابلے میں اپنے نفس کی پیروی میں طے کرتا ہے۔ اس کے پیچھے حبِ دنیا (مال، اولاد اور شہرت و اقتدار) سب سے بڑا محرک ہوتا ہے۔ یہ چیزیں جب اللہ اور رسول کی محبت کے مقابلے میں آ جائیں تو ترجیح ہر حال میں اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہونی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی بندگی

اسلام کا خلاصہ دین کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کا پہلا اور آخری مطالبہ عبادت ہے۔ عالم کے پروردگار کا فرمان ہے کہ: میں نے جنوں اور انسانوں کو (اپنی کسی احتیاج اور ضرورت کے لیے پیدا نہیں کیا بلکہ) صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت (بندگی) کریں (یہی چیز ان کی خلقت کی غائت اور ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔ اس کا پورا ہونا ہر حال میں مطلوب ہے۔ اس کی خاطر تو وہ ہر چیز کو قربان کر سکتے ہیں لیکن اسے کسی چیز پر بھی قربان نہیں کر سکتے۔ اسی لیے) نہ میں ان سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ رزق کا سامان کریں (اس لیے کہ انسان خود اپنے یا اپنی آل اولاد کی خاطر رزق حاصل کرنے کے لیے جو جدوجہد کرتا ہے وہ اس عالم اسباب میں اللہ کی ہدایت کا تقاضا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کی حیثیت ایک آلہ اور ذریعہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس کی کوششوں کو بارآور کرنے والا میں ہی ہوں۔ اگر میرا فضل شامل حال نہ ہو تو اس کی تمام تر صلاحیتوں اور کوششوں کے باوجود ساری محنت اکارت ہو کر رہ جائے) اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں (بلکہ اس کے برعکس وہ اگر خدائے واحد کی بندگی پر ڈٹے رہیں تو جان لیں کہ رازقِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے، سو وہ غیب سے رزق کی راہیں کھولے گا۔ وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے حوالے سے کسی بھی پہلو سے محتاج یا عاجز نہیں ہے) بلاشبہ اللہ ہی روزی رساں، زورآور اور قوت والا ہے (۵۱: ۵۶۔ ۵۸)

عبادت اصل میں عاجزی اور پستی ہے (اصل العبودیۃ الخضوع والتذلل) انسان اگر اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان رکھتا ہے اور وہ اس کی ساری صفات کے صحیح شعور کے ساتھ اسے مانتا ہے تو خدائے واحد کی بندگی کے نتیجے میں اس کے اندر انتہائی محبت اور انتہائی خوف کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کی بنیاد اس کی بے پناہ اور بے پایاں نعمتوں کا احساس ہے جو اسے بے مانگے اور بغیر استحقاق کے ملی ہیں اور خوف کی بنیاد کسی ڈراؤنی ہستی کا خوف نہیں بلکہ اس کا سبب یہ احساس ہے کہ کہیں اس کی بے پروائی، غفلت، سرکشی اور ناشکری کے نتیجے میں اس سے یہ نعمتیں چھن نہ جائیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کی بندگی کا صحیح شعور بندے کو بے پروائی اور غفلت سے بچاتا، سرکشی سے باز رکھتا اور شکر گذاری کو اس کا شب و روز کا وظیفہ بناتا ہے۔ پھر بندے کو اللہ پروردگارِ عالم کی یاد ہی سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس کی ناراضی سے ڈرتا اور ہر نفس اسی کا ہو کر رہنے کو زندگی سمجھتا ہے۔ وہ پھر اپنے ہر معاملے کو اسی کے سپرد کرتا اور اس کے ہر فیصلے کے سامنے دل کی پوری رضامندی کے ساتھ سر جھکا دیتا ہے۔ یہ وہ تبدیلیاں ہیں جو واقعی خدا کی بندگی اختیار کرنے کے نتیجے میں اس کے باطن میں رونما ہوتی ہیں۔ گویا یہ باطن کی عبادت ہے۔ اسی سے خدا کی مطلوب سچی بندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بندگی بندے کے اندر سے باہر کی طرف سفر کرتی ہے۔ اور جیسے اس کا باطن اللہ تعالیٰ

www.javedahmadghamidi.com

کے حضور پوری آمادگی کے ساتھ جھکا ہوا ہوتا ہے اسی طرح اس کا ظاہر بھی اللہ پروردگارِ عالم کے سامنے جھکنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ اور پھر شریعت اسے بتاتی ہے کہ خدا کی بندگی کا صحیح اور پسندیدہ طریقہ کیا ہے۔

خدا کی بندگی کی بنیاد تقویٰ، مطلوب رویہ احسان اور آخری نتیجہ تزکیہ نفس ہے۔

تقویٰ حدود شناسی کا نام ہے۔ اسے خدا سے ڈرنے کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بات یہاں پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اللہ سے ڈرنے اور بندوں سے ڈرنے میں بڑا فرق ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ بندے پر خدا کے جتنے (اور جیسے) حقوق ہیں وہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ دوسری یہ کہ خدا نے اپنی حدوں کو پامال کرنے اور انھیں توڑنے کی جو سزا مقرر کی ہے وہ تمام تر بندوں کے دنیوی فائدے اور اخروی فلاح و نجات کے لیے ہے۔ ان حدود کی پابندی سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ اس کا سارا فائدہ بندوں ہی کو ہوتا ہے۔ اور تیسری یہ کہ کبھی بھی کوئی اللہ تعالیٰ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا: اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو، وہ تمھارے ساتھ ہوتا ہے اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ سب کو (اور سب کچھ) دیکھتا ہے (کسی بھی حال میں تمھارا خیر و شر اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا) (۵۷: ۴) اور چوتھی بات یہ کہ خدا کی پکڑ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں جب چاہے اور جتنی چاہے سزا دے سکتا ہے۔ ان باتوں کو سامنے رکھیے اور اللہ تعالیٰ کی اہلِ ایمان کو دی گئی اس ہدایت کو سمجھیے کہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ تم اسلام پر ہو (۳: ۱۰۲) اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کی خشیت کا حق ادا کرنا بندوں کے بس ہی میں نہیں ہے، اسی لیے دوسری جگہ پر یہ وضاحت فرما دی کہ: جہاں تک ہو سکے تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو (۶۴: ۱۶) بندگی کے تقاضے پورے کرنے کی جو ذمہ داری انسان پر ڈالی گئی ہے، بے شک وہ ایک بھاری ذمہ داری ہے مگر اس کے بھاری ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عنایت کا یہ پہلو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ: اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا (۲: ۲۸۶) جو چیز اس کے حدود و اختیار اور امکان سے باہر ہے اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اسی طرح دین و شریعت میں مجبوریوں کی صورت میں رخصتیں بھی اسی لیے دی گئی ہیں کہ بندوں پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالا جائے جسے وہ اٹھا نہ سکتے ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس محبت اور انکسار کو صرف اور صرف اللہ (اور اس کے رسول) ہی کے لیے خاص کر دینا اور اس میں کسی بھی درجے میں دوسروں کو شریک نہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے (اور یہ انتہا نہ مطلوب ہے اور نہ بندگی کا لازمی تقاضا ہے) والدین، بہن بھائیوں، بیوی بچوں اعزا و اقارب اور دنیاوی مال و منال سے محبت اور ان کے لیے ایثار و انکسار اور میلان ایک ایسا معاملہ ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اس باب میں بندہ مومن سے بس اتنا تقاضا ہے کہ جب کبھی ان کی محبت اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے مقابل میں آ جائیں تو ترجیح ہر

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حال میں اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہوگی۔ اگر ایسا ہو تو پھر اللہ اور رسول کی محبت کے ساتھ ان محبتوں کا جمع ہونا بندگی کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہے، بلکہ یہ عین دین کا تقاضا قرار پاتی ہیں اور خدا کی بندگی میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ بس یہ خیال رہے کہ یہ اور اس طرح کی ساری محبتیں ہر حال اور ہر صورت میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے تابع رہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کی پہلی ترجیح قرار پائے۔

کیا اللہ واقعی بندہ مومن کی پہلی ترجیح بن گیا ہے؟ اس سوال کا جواب (اور اس کی پہچان) یہ ہے کہ بندہ مومن کے دل میں اللہ (پر سچا ایمان) اور خوفِ دنیا اور بے یقینی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اگر اللہ پر سچا ایمان موجود ہے تو پھر Fear & Frustration کے اس کے ساتھ باہم یک جا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ پھر اسے وہ اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے جو خدا کی یاد کا لازمی تقاضا ہے: سن لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے (۱۳: ۲۸) اگر دلوں کا اطمینان، ایمان کی روشنی اور شرحِ صدر کی نعمتیں مطلوب ہیں تو ان کا واحد ذریعہ اللہ تعالیٰ سے لازوال اور بے عیب محبت اور اور اس کے حضور بے ریا عجز وانکسار ہے۔

اللہ تعالیٰ اگر بندہ مومن کی پہلی ترجیح بن جائیں تو پھر خدا کا بندے سے سچا تعلق قائم رہتا ہے، اسے کبھی مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور خدا کے ہاں اس کی بڑی قدر ہوتی ہے۔

ہمارا عام طور پر (الا ماشاء اللہ) حال یہ ہوتا ہے۔ ہم اپنی حاجات وضروریات کے لیے اللہ کے سوا ہر در پر دستک دیتے ہیں اور ہر ایک کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ دنیوی مقاصد کے حصول کے لیے ہم دین اور آخرت کے تقاضوں کو بھی پسِ پشت ڈالنے سے گریز نہیں کرتے۔ اور جب چاروں طرف سے ناکام اور کسی حد تک مایوس ہو جاتے ہیں تو بادلِ نخواستہ آخری چارہ کار کے طور پر اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔ معمولی غور و فکر ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس صورت میں ہماری پہلی ترجیح اللہ تعالیٰ نہیں تھا بلکہ ہم اپنی ضروریات کی تکمیل اور خواہشات کی تسکین کے لیے زمینی سہاروں سے کسی حد تک مطمئن اور ان کے بارے میں پر امید تھے مگر ان سہاروں نے جب مایوس کیا اور ہمارے کسی کام نہ آئے تو پھر ہمیں خدا یاد آیا۔ ہماری پہلی ترجیح اگر اللہ تعالیٰ ہوتے تو ہم اپنی ہر ضرورت اور ہر خواہش کی تکمیل کے لیے ادھر ادھر دیکھنے کے بجائے دنیوی ذرائع واسباب کو ظاہری سہارا تصور کرتے اصلاً ہمارا پہلا اور آخری سہارا اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت ہی ہوتی۔

مطلوب ایمان

دین میں جو ایمان مطلوب ہے وہ واقعی اور حقیقی ایمان ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں اسلام قبول کرنے والوں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سے کلام کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ اسلوب اختیار کیا کہ انھیں پہلے: اے ایمان والو (کے لقب سے مخاطب کیا اور پھر اس کے بعد فرمایا کہ) ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری۔ اور جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کا انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا (۴: ۱۳۶)

اس کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے اقرار (کہ میں مسلمان ہوں) محض ایک رسمی اور ابتدائی (لیکن نہایت ضروری) کارروائی ہے۔ اس اقرار کے بعد ایمان کے مدعی سے لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ دین وشریعت کی ہدایت کے مطابق اچھے اعمال سرانجام دے اور اپنے ماحول اور دائرہ کار میں دوسروں کو حق اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کرتا رہے۔ اگر ایمان لانے کے بعد وہ عمل صالح نہیں کرتا تو اسے نہایت سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیے کہ اس کے ایمان لانے کے عمل میں کہیں کمی موجود ہے۔ ایمان لانے کے بعد بے عملی دراصل بے پروائی، سرکشی اور زبانی اقرار کا عملی انکار ہے۔ یہ رویہ ایمان اور اسلام کے منافی ہے۔ اور اگر وہ دوسروں کو حق اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو عمل صالح کر رہا ہے وہ دین کے مطلوب معیار پر پورا نہیں اترتا اور اس میں کوئی ظاہری یا مخفی نقص موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عمل دین کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

ایمان لانے کا عمل کوئی سادہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ فکر وعمل کی وہ قلبِ ماہیت ہے جس کے کچھ نتائج لازماً نکلتے ہیں۔ قرآن مجید میں جو ایمان لانے کا ذکر ہوا ہے وہاں ایمان سے مراد حقیقی ایمان ہے نہ یہ کہ چند رسومات کی ادائیگی کے ساتھ محض زبانی اقرار پر اکتفا کر لیا جائے۔

یہ بات بہت اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ ایمان اور کفر ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔: اور جو ایمان کے ساتھ کفر کرے گا (اور خدا اور رسول کے صریح احکام کے خلاف محض اپنی خواہشات کی اتباع میں قانون وشریعت ایجاد کر کے اس پر عمل پیرا ہوگا، تو ایسا ایمان اللہ کی بارگاہ میں ناقابل قبول ہے اور) اس کا عمل ڈھے جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا (۵: ۵) لہٰذا: جن لوگوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا اور اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی۔ یہی لوگ اصلی گمراہ ہیں (۳: ۹۰)

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ کفر یہی نہیں ہے کہ بندہ کسی چیز کا زبانی انکار کر دے۔ کفر یہ بھی ہے بندہ مان لینے کے بعد ایمان کے تقاضوں کے برخلاف رویہ اختیار کرے۔ اور کفر یہ بھی ہے کہ بندہ دین وآخرت کے بارے میں بے پروا ہو جائے اور کفر یہ بھی ہے کہ بندہ خدا کے احکام کے مقابلے میں غفلت، بے پروائی اور سرکشی کا رویہ اختیار کرے۔ اور کفر

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

یہ بھی ہے کہ کتابِ الٰہی کی جو بات اپنی خواہشات کے مطابق ہو وہ تو مانی جائے اور جو بات خواہشات کے خلاف ہو اسے پس پشت ڈال کر بے عملی کا مظاہرہ کیا جائے۔ اور بے پروائی اور سرکشی کی روش کو اپنا وطیرہ بنا لیا جائے۔

خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات کو نظر انداز کر کے اس طرح کا من مانا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں وہی ایمان قابلِ قبول ہوگا جو اس کی شرائط کے مطابق ہوگا۔

ایمان کا لفظ عربی زبان میں صدق و اعتماد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایمان اپنی حقیقت کے اعتبار سے تمام لوازم و شرائط اور پورے یقین، اعتماد اور اعتقاد کے ساتھ اللہ کو ماننے کا نام ہے۔ اس طرح کے ایمان کی پہچان یہ ہے کہ دل کی تصدیق اور زبان کے اقرار کے بعد اس کا قول اور عمل اس کے گواہ بن جاتے ہیں۔ قول و عمل کی گواہی بندے کے ایمان کی قبولیت کے لیے ایک لازمی شرط ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بسا اوقات قول اس کے دل کی تصدیق اور ایمان کے تقاضوں کے خلاف ہوتا ہے۔ قول کو صداقت کے محل پر قائم رکھنے والی قوت صرف اور صرف عمل ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایمان ہر حال میں عمل کے ساتھ جڑا رہے۔ یہی وہ چیز ہے جو ہمیں من مانا ایمان اختیار کرنے سے بچا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر جب ایمان کا ذکر ہوا ساتھ ہی عمل (صالح) کی شرط بھی عائد کر دی گئی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قرآنِ مجید سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہم سے پہلی امت یہود کا جب تورات پر ایمان بس زبانی اقرار تک محدود ہو کر رہ گیا اور عملاً انھوں نے اس کی تکذیب کر دی تو قرآن کہتا ہے کہ: ان لوگوں کی تمثیل جن پر تورات لاد دی گئی پھر انھوں نے اس کو نہ اٹھایا، اس گدھے کی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو (کہ جیسے گدھے کو اپنے اوپر لدی کتابوں کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا کہ ان میں کیا ہے، اسی طرح یہود بھی حاملِ تورات ہونے کے باوجود اس میں درج اللہ کے احکام کی پروا نہیں کرتے اور زبان سے اقرار کے باوجود ان کے خلاف عمل کرتے ہیں) کیا ہی بری تمثیل ہے اس قوم کی جس نے (زبانی اقرار کے بعد) اللہ کی آیات کی (ان کے خلاف عمل کر کے) تکذیب کی! اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا (اس طرح کے لوگ ہمیشہ ٹھوکریں کھانے کے لیے ہوائے نفس حوالے کر دیے جاتے ہیں) (۶۲:۵)

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم: اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے ان باتوں کا اقرار کیا اور تم اس کے گواہ بنے۔ پھر (اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ یہ) تم

ہی لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو۔ پہلے ان کے خلاف حق تلفی اور زیادتی کر کے ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو۔ پھر اگر وہ تمھارے پاس قیدی بن کر آتے ہیں تو فدیہ دے کر انھیں چھڑاتے ہو حالانکہ سرے سے ان کا نکالنا ہی تمھارے لیے حرام تھا۔ کیا تم کتابِ الٰہی کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں، ان کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں اور آخرت میں یہ شدید ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جنھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دی اس لیے نہ تو ان کا عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد ہی پہنچے گی۔ (۲:۸۴-۸۶)

بنی اسرائیل کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے کبھی تورات کی کسی ایک آیت کا بھی زبانی انکار نہیں کیا۔ وہ بس تورات کے احکام کے بارے میں غفلت، بے پروائی اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتے تھے، ان کا لحاظ نہیں رکھتے تھے اور عمل کے مواقع پر انھیں نظر انداز کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی رویے یعنی بے پروائی اور بے عملی کو کفر قرار دیا ہے۔

تورات میں بنی اسرائیل کے لیے جس طرح فدیہ دے کر قیدی چھڑانے کا حکم ہے اسی طرح یہ ممانعت بھی موجود ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کا نہ خون بہائیں گے اور نہ انھیں ان کی بستیوں سے نکالیں گے۔ انھوں نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دشمنوں کی مدد کر کے انھیں گھروں سے نکالا اور انھیں قتل کیا اور تورات کے احکام کو سر بازار پامال کیا، اور جب اپنے ہی بھائی دشمنوں کے ہاتھوں قیدی بن گئے تو انھیں فدیہ دے کر چھڑا لیا اور تاویل یہ اختیار کی کہ یہ تورات کا حکم ہے۔ اللہ کی کتاب کے بعض احکام کو ماننے اور بعض کی خلاف ورزی کرنے کو اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں کفر قرار دیا ہے۔

بنی اسرئیل کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہودیہ اور اسرائیل کی سلطنتیں الگ الگ قائم ہو جانے کے بعد ان میں حریفانہ کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں اطراف کے یہودی مخالف طاقتوں کو ابھار کر اپنے ہی بھائیوں پر چڑھائی کرا دیتے تھے۔ اور جب وہ دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوتے اور قیدی بن جاتے تو فدیہ دے کر انھیں چھڑا لیتے کہ تورات کا یہی حکم ہے۔

اللہ کے کچھ دینی احکام کی پاس داری اور کچھ کی مخالفت صریح منافقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس روش کو الہامی کتاب کے بعض حصوں پر ایمان لانے اور بعض کا کفر کرنے سے تعبیر کیا ہے۔

سچا صاحبِ ایمان بندہ اپنے دل و دماغ کو اپنے پروردگار کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ اپنا سب کچھ اللہ ہی کو

سونپ کر اس کے ہر فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔

جو لوگ شریعتِ الٰہی کے معاملے میں محض زبانی اقرار پر اکتفا کرتے ہوئے بے عملی کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ حالتِ کفر میں زندگی گذارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس رویے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: کیا تم کتابِ الٰہی کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں، ان کی سزا اس دنیا میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں اور آخرت میں یہ شدید ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے۔ اور اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو (۲:۸۵)

سچا اور حقیقی ایمان کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ وہ کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے اور: (اپنے ایمان کے دعوے میں سچے) ایمان والے تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز جائیں (کیوں کہ انھیں اپنے رب کی جلالتِ شان اور کبریائی کا شعور ہوتا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی بات ان کے سامنے اللہ کی بات کی حیثیت سے پیش کی جائے تو وہ اسے خوف و خشیت کے گہرے احساس اور اس پر فوری عمل پیرا ہونے کی نیت سے سنتے ہیں) اور جب اس کی آیتیں انھیں پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جائے (اس لیے کہ ان کی سب سے مرغوب اور مطلوب چیز خدا کی پسند و ناپسند، اس کی مرضیات اور اس کے احکام و قوانین ہی کا علم ہوتا ہے) اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھیں (ایمان کے مطالبے خواہ سخت ہوں یا نرم، ان سے ان کے دنیوی مفادات کو نقصان پہنچے یا انھیں فائدہ ہو، ان کی خاطر تعلقات ٹوٹیں یا جڑیں، وہ ہر حال میں دین و دنیا کی فلاح اپنے رب کے احکام کی تعمیل ہی میں سمجھتے ہیں) (۸:۲)

اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جہالت اور بے علمی کی بنیاد پر کیے گئے جرائم کے لیے یہ عذر قیامت میں قابل قبول نہ ہوگا کہ فلاں چیز کو ماننے یا کسی عمل کے کرنے کے بارے میں ہمیں معلوم نہ تھا۔ ایسی صورتِ حال میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ تم نے حقیقت کو جاننے کی کتنی کوشش کی؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ جاننے اور معلوم کرنے کی پوری کوشش کے باوجود ہم حقیقت کو پانے میں ناکام رہے ہوں اور اس کے نتیجے میں ایمان و عمل میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو ایسی صورت میں امکان ہے کہ اللہ تعالیٰ عذر قبول کر لیں۔ لیکن ایسی کمی کا باعث اگر بے پروائی، غفلت اور سرکشی ہوئی تو خدشہ ہے کہ قیامت کے روز یہ قابل سزا جرم تصور ہوگا۔

یہ دراصل بندے کا ارادے کی آزادی اور اختیار سے کیا ہوا عمل ہے جو انھیں آخرت میں جواب دہی کا سزاوار ٹھیراتا ہے۔

(باقی)